اشفاق احمد: چند اہم نظریات و تصوّرات

ڈاکٹر شازیہ صدف

ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو

اسلام آباد ماڈل کالج برائے خواتین، جی ۱۰-۲، اسلام آباد

ASHFAQ AHMAD
THOUGHTS AND CONCEPTS

Shazia Sadaf, PhD
Associate Professor of Urdu
Islamabad Model College (W), G10-2, Islamabad

Abstract

Ashfaq Ahmad is considered not only a patriotic Pakistani, but also an intellectual and reformer of nation in Urdu literature. His thoughts continued in multiple directions. He conceived and thought intellectually about various aspects of life, and presented his unique thoughts and theories in different writings. A study of his thoughts is essential to understand his personality, therefore, few of his thoughts are presented here in precise.

Keywords:

اشفاق احمد، غالب، اقبال، اسلام آباد، ادب، نثر، نظم، تقدیر، آزادیِ نسواں، عورت، مرد، جمہوریت، کشمیر

اشفاق احمد کا شمار ان نابغہ شخصیات میں ہوتا ہے جو عام انسانوں کی فکری و عملی سطح سے بالاتر ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں جو اپنی ایک منفرد سوچ رکھتے ہیں اور جن کے افکار و نظریات پوری قوم کے افراد کے لیے مشعلِ راہ بن جاتے ہیں۔ان کے نظریات کی بازگشت جہاں ان کی تحریروں میں سنائی دیتی ہے وہاں ان کے نادر اقوال بھی انھی خیالات کے مبلغ و ترجمان محسوس ہوتے ہیں۔اشفاق احمد کی شخصیت سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کے لیے ان کے افکار و نظریات سے آگاہی بھی ضروری ہے لہٰذا ان کے تشکیل کردہ نظریات کا اختصار سے جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

فلسفہء حیات

اشفاق احمد کا فلسفہء حیات بہت سادہ اور سہل ہے۔ان کے خیال میں زندگی ایک لمحہء محض ہے لیکن اس ایک لمحے میں صدیوں سے بڑا کام کرنے کی اہلیت بھی موجود ہے۔یہی عظمتِ انسانی ہے اور اسی خصوصیت کے سبب فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا۔وہ سمجھتے تھے کہ انسانی زندگی نہایت قدر و قیمت کی حامل ہے۔یہ محض جسمانی سطح پر کھانے پینے، افزائشِ نسل کرنے اور مر جانے تک محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ اس حیاتِ مختصر کو حیاتِ جاوداں میں تبدیل کرنے کے لیے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔

اشفاق احمد سمجھتے تھے کہ زندگی واپسی کی طرف ایک سفر ہے اور حیات و ممات ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ انسانی روح، روح پھونکنے والے کی طرف مراجعت چاہتی ہے جس طرح عاشق محبوب کی طرف سفر کرتا ہے۔''(۱)

اشفاق احمد کے فلسفہء زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ زندگی کو قبول کیا جائے اور حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔وہ باطنی زندگی کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ حالات پر اعتراض کرنے سے روح کو تکلیف ہوتی ہے کیونکہ حالات پر اعتراض کرنا خدا کی خوشنودی پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔(۲)ان کے اس نقطہء نظر سے بعض احباب کو اعتراض بھی رہا لیکن اشفاق احمد کے ہاں زندگی کے تمام رنگوں کو خوش دلی سے قبول کرنے کا رویہ بھی ملتا ہے۔ان سے کسی نے فلسفہء حیات کے متعلق دریافت کیا تو اس کے جواب میں انھوں نے کہا: ''آسانیوں میں رہنا، تاکہ جب کوئی قریب آئے تو میرے تناؤ کا شکار نہ ہو جائے۔''(۳)

نظریہء تعلیم

اشفاق احمد کا نظریہء تعلیم انتہائی منفرد اور جداگانہ تھا۔وہ لوک دانش کے رسیا تھے۔ان کے خیال میں تعلیم سے مراد حقائق سے آگاہی، نظم و ضبط قوانین کی پابندی اور تربیت ہے۔اس کے لیے لازم نہیں کہ

مدرسوں میں جا کر باقاعدہ سرٹیفکیٹ حاصل کیے جائیں۔ان کے خیال میں خوانچہ فروش اور ہل چلانے والا کسان بھی اسی قدر تعلیم یافتہ ہے جس قدر تعلیم یافتہ زراعت میں اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے والا شخص ہے۔وہ محض کتابی علم کے قائل نہیں تھے بلکہ تربیت کا بھی تقاضا کرتے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ ہر وہ ناخواندہ شخص بھی تعلیم یافتہ ہے جو اپنا کام ہنرمندی اور سلیقے سے کرتا ہے لہٰذا ان میں بھی ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ تقسیم ہونے چاہئیں۔

اشفاق احمد خواہاں تھے کہ ہر شخص کی عزتِ نفس کا خیال رکھا جائے۔انھیں شکایت تھی کہ عزت کو تعلیم سے مشروط کر دیا جاتا ہے اور سکولوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ افراد کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے اور عام ناخواندہ شخص کی تحقیر و تذلیل کی جاتی ہے۔ان کے خیال میں ان پڑھ لوگ جاہل ہرگز نہیں ہیں۔وہ مروجِ تعلیم کے اس لیے خلاف تھے کہ اس نظام کے تحت نصاب تو پڑھا دیا جاتا ہے لیکن ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے گر نہیں سکھائے جاتے۔وہ دیسی علم کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔ان کے خیال میں اس علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ایک مصاحبے میں کہتے ہیں:

> ''ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں کتابی باتوں کو صرف پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے نہ تو انھیں سمجھا اور نہ ہی اپنایا جاتا ہے۔اسی لیے تو ہم تعلیم یافتہ ہو کر بھی بدقسمت اور جاہل پڑھے لکھے ہیں۔''(۴)

انھیں اعتراض تھا کہ جدید تعلیم جو ہزاروں روپے خرچ کر کے حاصل کی جاتی ہے، وہ محض ایک دھوکہ ہے۔یہ وطن کی ترقی کی ضامن نہیں ہے۔ان کے خیال میں محض شرح خواندگی کو بڑھا دینا مسائل کا حل نہیں ہے۔وہ سری لنکا کی مثال دیتے تھے کہ جہاں شرح خواندگی نوے فیصد ہے لیکن ابتلا و آزمائش کے دور میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ان کا نظامِ تعلیم پر بڑا اعتراض یہ تھا کہ'' آج کے علما وقت کی آواز کو نہیں سمجھتے''وہ یونیورسٹی کے پروفیسروں کو کہا کرتے تھے کہ''تم لوگ علم کی بجائے گریڈوں کے پیچھے دوڑتے ہو''وہ چاہتے تھے کہ پروفیسر حضرات سیاست چھوڑ کر اپنے فرائضِ منصبی کو خوش اسلوبی سے انجام دیں۔ان کو اپنی توجہ تحقیق و تنقید پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ان کا خیال تھا کہ''اس ملک کو پڑھے لکھے لوگوں نے لوٹا ہے۔کسی لوہار، ترکھان، دھوبی، نائی اور تیلی نے اس ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ یہ صاحبانِ ہنر تو ہمیشہ ملک و قوم کی خدمت ہی کرتے ہیں۔''(۵)

اپنے اس خیال کی تائید میں اشفاق احمد یہ دلیل دیتے تھے کہ اسلام آباد میں چونکہ شرح خواندگی کا تناسب دیگر تمام شہروں سے زیادہ ہے اور حکومتی پالیسیاں بھی یہیں تشکیل دی جاتی ہیں لہٰذا ملک کے مسائل و عوارض کا سبب یہی تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔

ان کے اس نظریے پر بہت تنقید ہوئی۔تعلیم یافتہ لوگ ان کے اس نظریے سے سخت نالاں دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر اشفاق احمد کے نقطہء نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ اپنی جگہ درست دکھائی دیتے ہیں۔اگر ''پڑھے لکھے افراد'' سے ان کا اشارہ ''پالیسی بنانے والوں'' کی جانب ہے تو ان کا بیان حق وصداقت پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ افضال ریحان لکھتے ہیں:

> ''وہ جس طرح ان پڑھوں کو پروموٹ کرتے تھے،اس سے پڑھائی لکھائی یا تعلیم کی ناقدری محسوس ہوتی تھی جبکہ وہ بضد رہتے تھے کہ جو دھان لگاتا ہے، وہ دھان کا پی ایچ۔ڈی ہے۔ بھینس پالنے والا ان پڑھ بابا بھینسوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے جو پڑھا لکھا جانوروں کا ڈاکٹر نہیں جان سکتا یعنی وہ پڑھائی پر فطری تجربے ومشاہدے کو ترجیح دیتے تھے۔''(۶)

اشفاق احمد کی کسانوں میں باقاعدہ طور پر ڈگریاں تقسیم کرنے کی خواہش سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے کیونکہ غیر تعلیم یافتہ شخص کے فن کی قدر کرتے ہوئے اسے مسندِ عزت پر تو بٹھایا جا سکتا ہے لیکن اعزازی اسناد جاری کرنے سے اداروں کی نفی ہوجاتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ شدید خواہش اور نواز شریف کی حمایت کے باوجود خود بھی ایسا نہ کر پائے البتہ وہ ناخواندہ آدمی کی ''عزتِ نفس کے احترام'' کی جانب توجہ دلانے میں حق بجانب ہیں۔اشفاق احمد کا یہ شکوہ بجا معلوم ہوتا ہے:

> ''پاکستانیوں کا برہمن ازم استکبار کی دنیا میں بیٹھا ہوا ہے۔ہر ایک میں تکبر ہے۔۔۔ہماری تربیت نہیں ہوئی۔میں روز روتا ہوں۔میرے اوپر بہت الزام لگتا ہے کہ یہ تعلیم کے خلاف ہے۔میں کہتا ہوں مجھے صرف تعلیم نہیں چاہیے۔تربیت بھی چاہیے۔''(۷)

نظریہء ادب

اشفاق احمد ادب کی تفہیم وتخلیق میں کسی نظریاتی سانچے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کیونکہ تخلیق کا بیج کسی نظریے یا ازم کی سرزمین میں پنپ نہیں سکتا۔تخلیق میں آورد کے کمالات دکھانے سے اس کی اصلیت متاثر ہوتی ہے اور اس میں مصنوعی پن پیدا ہو جاتا ہے۔لہٰذا وہ خالص تخلیقی اظہار پر یقین رکھتے تھے۔ان کی اپنی تخلیقات بھی مروجہ ادبی تحریکوں اور نظریات کی زد سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔ابتداً ان کے طرزِ احساس نے رومانویت اور بعد ازاں سیاسی وسماجی شعور سے نمو پائی۔ابتدائی دور کے بعد وہ معلم اخلاق کی حیثیت سے سامنے آئے۔انھوں نے قلم کی تاثیر وبرکات کو نوجوانوں کے افکار ونظریات کی اصلاح کا وسیلہ بنا لیا تو ادب برائے مقصد کی راہ پر گامزن ہو گئے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے افرادِ ملت تک پیغامات کی ترسیل کرنے لگے۔ان کا خیال تھا کہ:

''ادیب کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ راہنمائی اور گائیڈنس مہیا کرے اور آپ پھر آگے چل کر اس سے استفادہ کریں یا نہ کریں۔''(۸)

تاہم ان کی کہانیاں محض پند و نصائح کے پیکر محسوس نہیں ہوتیں بلکہ ان میں فنی لوازم کے بھرپور اہتمام کے ساتھ ساتھ لطف کا عنصر مکمل طور پر شامل رہتا ہے کیونکہ وہ فن کو مقصدیت پر قربان کرنے کے حق میں نہ تھے بلکہ تفریح کے عنصر کو بھی فن کا لازمہ خیال کرتے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ فن سے تفریح کو منہا کر دینے سے فن پارہ موثر نہیں رہتا۔لوگ ہمیشہ دلچسپ تخلیق کو پڑھتے اور سراہتے ہیں لہٰذا ادب میں مقصد اور تفریح ہم قدم رہنے چاہئیں۔

وہ اصناف نثر میں ''ڈراما'' کو نہایت طاقتور صنف قرار دیتے ہیں۔ان کے نقطہ نظر کے مطابق ڈرامے کا قوم سے رشتہ مستحکم ہونا چاہیے۔یہ اسی صورت ممکن ہے جب ڈراما نویس قوم کی ترجیحات کو پیشِ نظر رکھے اور ان ترجیحات سے شناسائی حاصل کرنے کے لیے عوامی زندگی کے دائروں میں اترنے کی کوشش کرے۔افراد کے درمیان گردش و حرکت سے ہی ان کی پسند و ناپسند کا اندازہ لگانا ممکن ہے جبکہ فاصلوں سے حقیقی زندگی کا عکس دکھائی نہیں دیتا۔وہ ڈرامے کو سچائی کا مظہر دیکھنے کے متمنی تھے۔

اشفاق احمد بنیادی طور پر نثر نگار تھے لیکن وہ شاعری کی قوت کے معترف اور ادب میں اس کے بلند مقام کو تسلیم کرتے ہیں۔وہ پاکستانی غزل کے معیار اور موضوعات سے مطمئن جبکہ نظم سے بہتری کی توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے۔وہ متقاضی تھے کہ:

''ایسی نظمیں لکھی جانی چاہئیں جن کا کوئی مقصد ہو۔نظم میں بھی بہت طاقتور بات کہی جا سکتی ہے۔۔۔جیسی نظمیں ۱۹ویں صدی میں شیلے اور کیٹس وغیرہ نے لکھی تھیں یا بعد میں ٹی۔ ایس۔ایلیٹ وغیرہ نے لکھی تھیں۔ہمارے ہاں اس کی داغ بیل نہیں ڈالی جا سکی۔''(۹)

وہ ادب کو سچائی کا مبلغ اور حقائق کا مترجم قرار دے کر تخیل اور امکان کی نفی نہیں کرتے بلکہ واقعاتی حقائق کے ساتھ ساتھ امکانی صداقتوں کا بیان بھی ادیب کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں،محض حقائق ظاہری تک رسائی حاصل کرنا ایک سائنس دان کی منزل جبکہ نئی دنیاؤں کی تسخیر ادیب کا مقامِ فکر و نظر ہے۔وہ کہتے ہیں:

''ادیب سائنٹسٹ کے قریب قریب ہوتا ہے۔سائنٹسٹ بھی تجسس میں رہتا ہے۔اسے کائنات کی سمجھ نہیں آتی اور ادیب کو بندے کی سمجھ نہیں آتی اور بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو ایک جگہ بیٹھ کر لائنیں نہ کھینچتا رہے کہ یہی بات درست ہے۔وہ حیران ہی رہے،سوچتا ہی رہے۔''(۱۰)

اشفاق احمد ادب کے اجزائے ترکیبی میں تحیّر واستعجاب کے عناصر کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ان کی موجودگی تخلیق کو تجسّس اور دلچسپی سے معمور کرتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''یہ ادب ہے کہ انسان حیرانی سے سوچتا رہے کہ وہی آدمی جو پہلے ہیرے، سونے، چاندی عدالت میں جمع کروا گیا تھا۔اس نے بعد میں سونے کی معمولی بالیوں کے لیے قتل کیوں کر دیا۔''(۱۱)

بانو قدسیہ کے خیال میں ان کا نظریہء ادب یہ تھا کہ ادیب کو شہرت اور قبولیتِ عام کی سند عطیہء خداوندی کے طور پر عطا ہوتی ہے۔اس میں کسی ادیب کی ذاتی کاوش یا صلاحیّت کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔وہ کہتی ہیں:

''ان کا نظریہ یہ تھا کہ ہر عہد اپنے مشاہیر تلاش کر لیتا ہے۔ہر عہد کے مشاہیر مختلف ہوتے ہیں۔کچھ ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو اللہ کی طرف سے یہ دین ہوتی ہے۔وہ ادبی مشاہیر چلتے رہتے ہیں، جیسے غالبؔ چلتا آرہا ہے۔اقبالؔ چلتا آرہا ہے۔یہ اوپر والے کی مرضی سے ہوتا ہے۔انسان کی کوشش سے نہیں۔مٹھی بھر آدمی ہوتے ہیں جو اوپر آجاتے ہیں۔ہر بیس سال کے بعد یہ ارتقا ہوتا رہتا ہے لیکن کسی کسی کے نصیب میں یہ دوامی شہرت آتی ہے۔''(۱۲)

فلسفہء جبر وقدر

اشفاق احمد تقدیر کے قائل تھے۔ان کے خیال میں رزق اور کامیابی سب کچھ خدا کی منشا کے تابع ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان کی محنت وکوشش کو بہت اہمیّت دیتے تھے۔وہ فرماتے ہیں:

''انسان کو ہر حال میں محنت کرتے رہنا چاہیے۔اس محنت کا تعلق کامیابی کے ساتھ نہیں ہے۔وہ تو خدا نے دینی ہے، لیکن بشریت کی شان یہ ہے کہ وہ محنت سے جی نہ چرائے۔''(۱۳)

وہ اظہارِ تاسف کرتے ہیں کہ لوگ ابتلا وآزمائش کی گھڑی میں فوراً تقدیر کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتے ہیں لیکن اپنے کسی عمل میں خدا کی رضا کا خیال نہیں رکھتے۔احکاماتِ الٰہی کو نظر انداز کر کے محض اپنی خواہش کے راستوں پر چلتے ہیں، بعد ازاں واویلا کرنے لگتے ہیں کہ خدا ان کی مدد نہیں فرماتا۔وہ تقدیر کے سامنے بے بس ہیں، وہ اپنی تیرہ بختی کو خوش بختی میں کیسے تبدیل کر سکتے ہیں۔اشفاق احمد کہتے ہیں:

''ہاں خدا کو ترس آنا چاہیے لیکن آپ خود بھی اپنے آپ پر ترس نہیں کھاتے۔جو آپ چاہو وہ کر لیتے ہو لیکن جہاں طبیعت پر بوجھ پڑے، وہاں نہیں جاتے۔''(۱۴)

ان کا عقیدہ تھا کہ نام، مقام اور شہرت سبھی کچھ نصیب سے ملتا ہے اور ہمیں اپنی قسمت کی نوازشات پر قانع

رہنا چاہیے۔زندگی میں اگر کسی کی طلب ہوتو اس کے حصول کے لیے جدّ وجہد کرنی چاہیے اور پھر معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔

آزادیِ نسواں

اشفاق احمد عورت کو گھر کی بنیادی اکائی اور معاشرے کی اہم ترین ضرورت خیال کرتے تھے اور اس کے دائرہ عمل کو گھر کی چار دیواری تک محدود قرار دیتے تھے۔وہ نام نہاد آزادیِ نسواں کے سخت خلاف تھے اور عورت کو مرد کی منشا اور مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے تھے گو کہ وہ بزرگ خواتین کو ''اخلاق کے ادارے'' قرار دیتے تھے۔مثلاً ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''اخلاقیات کو قائم کرنے کے لیے نانیوں اور دادیوں کا ادارہ قائم کرو۔۔۔وہ اپنے کمزور ہاتھوں سے اخلاق کی طنابوں کو پکڑ کر رکھتی تھیں۔'' (۱۵)

لیکن پسِ پردہ معاشرے کی بگڑتی ہوئی اخلاقیات کا ذمہ دار طبقہ نسواں کو ہی ٹھہراتے تھے، جو مردوں کے اعمال و افعال کی نگرانی کے فرض سے غافل ہو چکا ہے۔اشفاق احمد تعلیم یافتہ عورت کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> ''آج کی تعلیم یافتہ عورت اچھا میک اپ کر سکتی ہے، اپنا آپ سنوار سکتی ہے، معاشرہ نہیں سنوار سکتی۔''(۱۶)

اشفاق احمد کا یہ بیان انتہائی شدّت کا حامل ہے۔اگر تعصّب کی گرد صاف کر کے دیکھا جائے تو تعلیم یافتہ عورت نہایت باشعور اور عقلمند ہے اور اس کا وجود معاشرے اور اس کے گھر کے لیے آج بھی اسی قدر خیر و برکت کا باعث ہے۔وہ اندرونِ خانہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینے کے ساتھ ساتھ مرد کی معاشی معاونت بھی کر رہی ہے۔درحقیقت اشفاق احمد عورت کی منفرد شخصیت اور وجود کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔انھیں مرد کے تابع اور اس کا ہر حکم خاموشی سے مان لینے والی عورت ہی اپنے مقام پر دکھائی دیتی تھی جو اپنے حقوق کے لیے کبھی آواز بلند نہ کرے۔یہاں ان کے نظریات مرد کی روایتی سوچ کے مظہر ہیں لہٰذا وہ ازدواجی زندگی کا ذمہ دار بھی فریقِ واحد ''عورت'' کو ہی گردانتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ آج عورت کا شعورِ ذات ہی اس کی ناکامی کا باعث ہے۔

ان کے اس خیال سے جزوی طور پر اتفاق کی گنجائش موجود ہے کہ عورت کے فکرِ معاش میں گھر سے باہر جانے پر گھریلو نظام متاثر ہو سکتا ہے اور روپیہ کما لینے سے بچوں کے احساسات کی تسکین ممکن نہیں ہے۔انھیں ماں کی توجہ اور پیار بھی چاہیے۔مادی آسائشوں کو ماں کا نعم البدل قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن اشفاق احمد ایسی خواتین کو بھی بلند رتبہ دینے کو تیار نہیں جو اپنی تمام تر مصروفیات اور توجہ اپنی اولاد پر مرکوز

رکھتی ہیں ۔ان کے ایک انٹرویو سے اقتباس ملاحظہ فرمایے:

''گھریلو زندگی نہ ماں کا رتبہ زیادہ ہے نہ باپ کا، دونوں کو اسلام ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔اسلام تو اس کو نہیں مانتا کہ عورت کا درجہ مرد سے زیادہ ہو۔''(۱۷)

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام والدین میں سے دونوں کو بہت عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن ماں کا درجہ باپ سے تین گناہ زیادہ ہے۔اس حوالے سے اسلام میں واضح احکام موجود ہیں جن سے کسی طور انکار ممکن نہیں ۔شاید اشفاق احمد کی مردانہ انا نیت انھیں اس طرح کے بیانات دینے پر اکساتی تھی۔

وہ اس بات کے تو قائل تھے کہ عورت گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر دستکاری کے ذریعے یا کسی دوسرے ہنر کو استعمال میں لاتے ہوئے معاش کا ذریعہ پیدا کرے اور مرد کی معاونت کرے لیکن اسے یہ آزادی دینے کے قائل نہ تھے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے اپنی کوئی پہچان پیدا کرنے کی کوشش کرے ۔اس قسم کے نظریات کی تشکیل سے ان کی رجعت پسندی کا کسی قدر اظہار ہوتا ہے ۔وہ نئے زمانے کی آواز کو خواتین کے حوالے سے قبول کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھے، وگرنہ احترامِ آدمیت اور عزتِ نفس کی پاسداری کا پیغام سدا ان کے لبوں پر موجود رہتا تھا۔

نظریہء تفریح

اشفاق احمد کے مطابق اگر انسان کے قلب و ذہن مطمئن اور مسرور ہوں تو اسے معمولی چیزیں بھی لطف دیتی ہیں ۔تفریح کے حصول کے لیے اپنے احساسات کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ رقم طراز ہیں:

''جس بچے کی تفریح مرغی کے سترہ چوزے ہوں، اس کے سامنے منڈوے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ۔ہماری ذاتی خوشیاں سچی خوشیاں تھیں ۔آپ چھوٹی چھوٹی خوشیاں خرید لاتے ہیں ۔اب آپ اخبار میں کالم لکھتے ہیں ۔میں کالم پڑھتا ہوں کہ لوگوں کو خوشیاں ملنی چاہئیں ،لوگوں کو تفریح ملنی چاہیے ۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جب بندے کے اندر ہی خوشی نہ ہو تو آپ باہر سے اسے کیسے خوشی مہیا کر سکیں گے۔''(۱۸)

وہ سمجھتے تھے کہ انسان کو معمولی باتوں سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ آنا چاہیے۔

نظریہء اقدار

اشفاق احمد کا نظریہ یہ تھا کہ انسانی اقدار کی تشکیل معاشرے یا گروہ انسانی کے متفقہ فیصلوں سے ہوتی ہے ۔ان اقدار کا فلسفے ،دین یا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لہٰذا جب ان اقدار میں تبدیلی یا تغیر پیدا ہوتا ہے تو یہ بھی انسانوں کا ذاتی فیصلہ ہوتا ہے ۔دوسرے لفظوں میں اقدار کی تشکیل اور ان کی توڑ پھوڑ

دونوں کا ذمہ دار انسان ہی ہے اور انسان کو اپنے غلط فیصلوں کی ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیے۔وہ ایک مصاحبے میں بتاتے ہیں کہ:

> ''(ویلیوز) یعنی قدروں کا تعلق ہے تو میں کہنا چاہوں گا کہ قدروں کا دین، فلسفے یا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔یہ گروہِ انسانی کے فیصلے کا نام ہے۔جب ایک معاشرے کے لوگ مل کر بیٹھتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی اس انداز سے گزاریں گے تو وہ قدر کا ظہور ہوتا ہے۔پھر یہی اقدار قوانین کا رخ اختیار کر لیتی ہیں۔ایسے ہی معاشرتی فیصلوں میں گروہِ انسانی میں مردوں کے طبقے کو روٹی کمانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور عورت کو ویلیوز کا نگہبان بنایا گیا۔''(۱۹)

ان کے خیال میں آج اقدار اس لیے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کہ ہم نے اپنا نگہبان کھو دیا ہے۔وہ سمجھتے تھے کہ ابھی اقدار سسک رہی ہیں لیکن ان میں زندگی کی رمق باقی ہے۔انھیں عقیدے کی مضبوطی سے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔اشفاق احمد نبی کریم ﷺ کے عہد میں مدینے کے معاشرے کو آئیڈیل معاشرہ قرار دیتے تھے۔وہ اس معاشرے کی اقدار کو قابلِ تحسین گردانتے ہوئے یہ صلاح دیتے تھے کہ ہمیں انھی اقدار کو آج کے معاشرے میں بھی رواج دینا چاہیے۔

نظریہء تصوف

اشفاق احمد کی تحریروں میں ان کے فلسفہء تصوف کی گونج سنائی دیتی ہے۔اگر نظری سطح پر دیکھا جائے تو انھوں نے ''صوفی'' کا لفظ نیک طینت اور پاک فطرت لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جن کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو سکتا ہے۔ان کا خیال تھا کہ ایک جہاندیدہ سیاستدان، خلاؤں تک پہنچنے والا سائنسدان، علم بانٹنے والا عالم، ہل چلانے والا کسان اور خیر تقسیم کرنے والا کوئی بھی شخص صوفی کہلانے کا مستحق ہے، بشرطیکہ اس کا دل تکبر اور کدورت کی آلائشوں سے پاک ہو اور اس کے مصفّٰی دل میں نیکی اور خیر کی تجلّیات موجود ہوں۔

وہ تصوف میں انسان کی باطنی زندگی کو بہت اہمیّت دیتے تھے اور صوفی کے حوالے سے عمومی تصور کی نفی کرتے تھے کہ صوفی ظاہر میں کوئی معمولی لباس زیبِ تن کیے دنیا و مافیہا سے غافل کسی گوشہء تنہائی میں بیٹھا مصروفِ عبادت شخص ہی ہو سکتا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ جلیبے یا ملازمت کو عبادت کی راہ میں رکاوٹ نہیں گردانتے تھے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ ایک تھری پیس سوٹ پہنے اور معاملاتِ زندگی کو سلجھاتا سنوارتا ہوا شخص بھی صوفی ہو سکتا ہے۔اس کی پہچان یہی ہے کہ وہ خیر بانٹنے والا شخص ہو۔

اشفاق احمد تصوف میں پیرِ کامل کی تلاش پر بہت زور دیتے تھے۔ان کے خیال میں باطنی زندگی

کے حامل افراد کی تلاش کرنی چاہیے لیکن ایسے افراد اپنے اردگرد ہی دکھائی دے سکتے ہیں۔انھیں تلاش کرنے کے لیے بستیوں سے دور جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ ''بابا'' کو لوک دانش کی علامت تصور کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسے روحانی پیشوا قرار دیا جا سکتا ہے۔

عملی سطح پر وہ خدمتِ خلق کو تصوف کی پہلی سیڑھی قرار دیتے تھے اور سلوک کی تمام تر منازل طے کرنے کے لیے اسی اسم کا ورد ضروری سمجھتے تھے۔سلوک پر گامزن شخص کی بنیادی پہچان ہی اس کی عاجزی اور خدمتِ خلق ہے۔جو شخص خیر بانٹنے میں آگے ہے وہ سلوک کی بالائی منزل پر ہے۔جس ذات کے فیضان سے عوام الناس کو آسانیاں میسّر ہوں، وہی صوفی ہے۔

نظریہء سیاست

اشفاق احمد سیاسی آدمی نہ تھے لیکن ایک دانش ور اور باشعور انسان ہونے کی حیثیت سے سیاست کے زیر و بم سے بخوبی آشنا تھے۔وہ حکومت کی تشکیل کردہ پالیسیوں سے غیر مطمئن اور سیاسی رویّوں سے ناخوش دکھائی دیتے تھے۔انھیں مختلف سیاسی نظریات کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا ادراک تھا اور وہ ان پر رائے زنی بھی کرتے رہتے تھے۔

وہ مغرب سے درآمد شدہ نام نہاد ''جمہوریت'' کو پاکستانی سیاست کے عوارض کا واحد حل نہ گردانتے تھے لہٰذا وہ دن رات جمہوریت کا راگ الاپنے والوں کو تنبیہ کرتے رہتے تھے کہ:

> ''جس قسم کی جمہوریت امریکہ یا انگلستان دے رہا ہے یہ دنیا کے سارے ملکوں کو راس آسکتی ہے لیکن مسلم امہ کو راس نہیں آسکتی۔''(۲۰)

ان کا خیال تھا کہ ہر ملک کے جغرافیائی، موسمی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی حالات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔خطے آرزوئیں، علاقائی رسم و رواج اور وسائل دوسرے خطوں سے جداگانہ ہوتے ہیں لہٰذا کوئی ایک سیاسی نظریہ خواہ کتنا ہی کامیاب اور تسلّی بخش کیوں نہ ہو، تمام خطوں کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔

انھیں یہ شکایت تھی کہ جمہوریت کو حرفِ آخر قرار دے کر سوچ پر قدغن لگا دی جاتی ہے۔وہ ایک مصاحبے میں کہتے ہیں:

> ''میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہوں گا جو یہ کہتے ہیں کہ گندی سے گندی جمہوریت بھی اعلیٰ درجے کے شیر شاہ سوری سے بہتر ہوتی ہے یا بدترین جمہوریت بھی اعلیٰ درجے کے ماؤزے تنگ سے بہتر ہے۔''(۲۱)

وہ جمہوریت کو بزورِ شمشیر پھیلانے پر واویلا کرتے ہیں کہ اس کو ہم پر زبردستی مسلط کرنا بھی تو جبر کے مترادف ہے جبکہ یہ شاخِ بے ثمر ثابت ہو رہی ہے۔جمہوریت کے نام پر بھی مخصوص خاندانوں کی حکومت

ہی جاری ہے۔اشفاق احمد بہت سے جمہوری ملکوں کی مثالیں دیتے ہیں۔مثلاً وہ بھارت کے حوالے سے کہتے ہیں:

''بھارت میں چھیالیس برسوں سے جمہوریت کی حکمرانی ہے۔بیچ میں کوئی رخنہ پڑا ہے نہ تعطل پیدا ہوا۔اسے دنیا کی بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔میں پوچھتا ہوں کہ وہاں جو ہر روز تو ڑپھوڑ ہوتی ہے،بندوقیں چلتی ہیں اور بم پھٹتے ہیں تو وہ کیوں؟''(۲۲)

وہ جمہوریت کے ساتھ وابستہ ''سرمایہ داری'' کی بنیادیں سود پر ہونے کے باوصف اسے اسلامی معاشرے کے لیے لعنت قرار دیتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ''اسی جمہوریت نے فاشزم کو بھی جنم دیا ہے۔''(۲۳)

جہاں تک فوجی نظامِ حکومت کا تعلق ہے تو ابتداً ان کے ہاں اس کی قبولیت کا رویہ ملتا ہے۔وہ صدر ایوب خان کے زمانے کو پاکستانی سیاست کے مختلف ادوار میں سب سے اچھا قرار دیتے تھے لیکن بعد ازاں فوجی نظامِ حکومت سے بھی ان کا نظریاتی اختلاف پیدا ہوگیا۔وہ کہتے ہیں:

''میں یہ کہتا ہوں کہ جو مارشل لا ہے یا فوجی حکومت ہے، یہ ایک لعنت ہے۔میں پہلے بہت حق میں تھا۔میں سمجھتا ہوں کہ ایوب خان کی ہم نے بڑی خدمت کی،آؤ بھگت کی،شاید ملک کا فائدہ ہوگا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ فوجی اس کام کے لیے نہیں بنے ہیں۔''(۲۴)

اشفاق احمد جمہوریت کو ملکی اور معاشرتی حالات کی تقلیب کا اہل نہیں گردانتے۔ان کے خیال میں یہ انقلاب کا موجب نہیں بن سکتی۔ملکوں اور قوموں کی حالت کو منقلب کرنے کے لیے سیاسی نظریات کی نہیں بلکہ ایسے افرادِ ملت کی ضرورت ہوتی ہے جو شب و روز کی محنت سے قوموں کی تقدیر بدل دیتے ہیں:

''چاہے وہ ماؤزے تنگ ہو چاہے ہو چی منہ ہو اور چاہے قائداعظم ہو''(۲۵)

وہ سیاسی نظام کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اسلام کی جانب رجوع کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں کہ وہ سیاسی اصول وضوابط جو صحائفِ آسمانی اور انبیائے کرام کے وسیلے سے عطا ہوئے ہیں ان کے مقلد بن کر ہی ہم فاتحِ عالم ہو سکتے ہیں لہٰذا وہی بہترین نظامِ حکومت ہے۔

ان کے خیال میں پاکستانی قوم کی راہِ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے والے عناصر میں سرِفہرست حکمران طبقے کی مفاد پرستی،عدم مساوات،عدل کی کمی،وطنیت کا تصور اور صوبائی عصبیت وغیرہ ہیں۔وہ مجوب ہونے کی عادت کو بھی قومی تشخص کے لیے ایک بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں اور اپنے دفاعی نظام کی مضبوطی کے لیے احساسِ کمتری اور مجوبیت سے چھٹکارا پانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔انھیں شکایت تھی کہ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جو ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود لرزہ براندام رہتا ہے۔اگر یقین وایمان کی پختگی حاصل ہو جائے تو سرحدیں خود بخود محفوظ ہو جائیں گی۔

جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے اس کے حوالے سے اشفاق احمد پاک بھارت تعلقات کو پاکستانی عوام کے لیے خودکشی کے مترادف گردانتے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسا دشمن ہے جو ہماری سرحدوں سے دور رہتے ہوئے بھی مستقل ہمارے لیے ذہنی پریشانی اور تشویش کا باعث ہے۔اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی استواری خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے اشفاق احمد اقوامِ متحدہ کے اداروں کی فعالیت پر زور دیتے رہے۔وہ بھارتی ادبا اور مصنفین کی اس نازک ترین مسئلے کے حوالے سے خاموشی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''کوئی ایک ادیب برٹرینڈ رسل اور سارتر کے قدموں کی خاک جیسا بھی نہیں کہ وہ کھڑے ہو کر اپنی حکومت کو للکارتا کہ تم یہ کیا ظلم کر رہے ہو۔''(۲۶)

کشمیریوں کے حوالے سے ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ جہادی نہیں ہیں بلکہ 'فریڈم فائٹر' ہیں جو اپنے ملک کو دشمن کے قبضے سے آزاد کروانے کے جائز حق کے تحت برسرِ پیکار ہیں۔وہ سمجھتے تھے کہ ایک دن کشمیر آزاد ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی بھارت کی کئی دوسری ریاستیں بھی آزادی کا مطالبہ کر دیں گی، یوں بھارت کی تقسیم ایک ناگزیر عمل ٹھہرے گا۔

اشفاق احمد کے نظریات و خیالات سے آگاہی کے بعد ہم چاہے ان کے زاویہ ہائے فکر سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ان کے اخلاص اور حبِ انسانیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔وہ عظمتِ انسانی کے شدت سے قائل تھے اور چاہتے تھے کہ انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا احترام کیا جائے تاکہ پاکستانی معاشرے کو ایک مثالی معاشرے کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱)(انٹرویو؛افضال ریحان)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)لاہور؛ زاویہ پبلشرز،۲۰۰۴ء۔ ص۲۹۸

(۲) خالد حسن''اشفاق احمد ۔چند یادیں''مشمولہ زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا(مرتب:اعزاز احمد آذر) لاہور: خالد بک ڈپو،۲۰۰۴ء۔ص۲۵۳

(۳) ''اشفاق احمد کی بصیرت افروز باتیں''مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۲۴۵

(۴) ''اشفاق احمد۔ بچوں کے روبرو''مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۴۰۲

(۵)افضال ریحان''ہمارے بابا جی مشرقی فکر و دانش کا نمونہ تھے''مشمولہ زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا(مرتب: اعزاز احمد آذر)ص۲۷۱

(۶) (انٹرویو: حامد یزدانی)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۲۷۰

(۷)(انٹرویو: سہیل وڑائچ)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۳۶

(۸) ایضا۔ص۳۲

(۹) ایضاً۔ص۲۷

(۱۰)(انٹرویو: عفت بتول)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۱۵۶

(۱۱) ایضاً۔ص۱۵۷

(۱۲) بانو قدسیہ سے مصاحبہ(ملاقات: راقمہ) بمقام قیام گاہ بانو قدسیہ ماڈل ٹاؤن، لاہور:۲جنوری ۲۰۰۷ء

(۱۳) (انٹرویو: افضال ریحان)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۳۳۴

(۱۴) (انٹرویو: احمد لطیف)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۴۸۲

(۱۵) (انٹرویو: ڈاکٹر انور سدید)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۱۲۹

(۱۶)ایضاً

(۱۷)(انٹرویو: افضال ریحان)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۳۱۹

(۱۸)(انٹرویو: حامد یزدانی)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۲۷۲

(۱۹) (ماہنامہ پھول کی تقریب میں اشفاق احمد کا اظہار خیال)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل) ص۳۴۱

(۲۰) (انٹرویو: ڈاکٹر انور سدید)مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ؛محمد نواز کھرل)ص۱۳۱

(۲۱) ایضاً۔ص۱۲۸

(۲۲) ''اشفاق احمد کی سحر انگیز باتیں'' مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ: محمد نواز کھرل) ص ۱۰۴

(۲۳) ایضاً

(۲۴) ایضاً۔ص ۳۰۹

(۲۵) (انٹرویو: علی سفیان آفاقی) مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ: محمد نواز کھرل) ص ۱۷۵

(۲۶) (انٹرویو: اجمل نیازی) مشمولہ باتوں سے خوشبو آئے (مرتبہ: محمد نواز کھرل) ص ۱۱۷